نقد و نظر

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

سچا اجتہاد

مجتہد کو جو چیز صحیح اجتہاد کے راستے پر راہنمائی کرتی ہے وہ علوم قدیمہ اور علوم جدیدہ علم ہی نہیں بلکہ خدا کی محبت اور معرفت کا نور بھی ہے۔ انحطاط دین کے اس زمانہ میں یہ نور نایاب نہیں تو صعب الحصول ہے۔ اس سے پہلے کہ کسی مسلمان کے دل میں یہ نور پوری طرح سے روشن نہ ہو صرف یہ ضروری ہے کہ وہ عرصہ دراز تک قرآن اور حدیث کے گہرے مطالعہ میں لگا رہے اور صحابہ اور آئمہ اور صلحا کی پاکیزہ اور مجاہدانہ زندگیوں سے اثر پذیر ہو۔

کہا جاتا ہے کہ اس وقت اسلام کے معاشرتی قوانین کو بدلنے کی فوری ضرورت ہے لیکن جب تک اسلام کے اخلاقی اور مذہبی قوانین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اسوقت تک ہم اسلام کے معاشرتی قوانین کی بھی کوئی عزت نہیں کر سکتے اور اسوقت ٹھیک طرح سے یہ بھی نہیں جان سکتے کہ ہمیں اسلام کے معاشرتی قوانین کو کس طرح بدلنا چاہیئے اور آیا ان کو بدلنے کی ضرورت بھی ہے یا نہیں۔

سچا اجتہاد ہمیشہ اسلام سے گہری محبت کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس محبت کی وجہ سے وہ اس شریعت کی ایک قدرتی اور بے ساختہ نشو ونما کی صورت اختیار کرتا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے ہمارے لئے چھوڑی ہے۔ اجتہاد کے لئے ہماری موجودہ خواہش اسلام کی محبت کا نتیجہ نہیں بلکہ اسلام کی پوشیدہ نفرت اور غیر اسلامی نظریات کی چھپی ہوئی محبت وستائش کا نتیجہ ہے۔ اس کا مقصد درحقیقت یہ ہے کہ اسلام کے احکام کو اس طرح سے بدل دیا جائے کہ وہ ہمارے ان خیالات اور تصورات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں جو ہم نے غیر اسلامی نظریات سے مستعار لئے ہیں اور جن کو ہم دل ہی دل [illegible] چاہتے اور بنظر استحسان دیکھتے ہیں۔ یہ خواہش دراصل اس بات کی ایک کوشش [illegible] دور کیا جائے جو ہم نے دوسروں کے نظریات سے [illegible] حسن وجمال [illegible] شان وشوکت" سے جن کا نظارہ [illegible]

[illegible]

([illegible] ۳۳،۳۲)

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

اسلامی تعلیم کے چند مسائل

اسلامی تعلیم کے ضمن میں بہت سے موضوعات ایسے ہیں جو بڑی توجہ اور غور و فکر کے محتاج ہیں۔ مثلاً مسلمانوں کے مرض اختلاف کی تحقیق اور علاج، جدید و قدیم کے امتزاج کی ضرورت طبقۂ علماء اور جدید تعلیم کے حاملین میں مفاہمت کی کوشش اور موجودہ دور کے تقاضوں کا لحاظ وغیرہ وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ یہ سب مسائل بنیادی ہیں اور ان مسائل کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ اس لئے گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔

سب سے پہلے اختلاف کے مسئلہ کو ہی لیجئے۔ مسلمانوں کی تباہی کا سب سے بڑا سبب ان کا باہمی اختلاف ہے لہذا گزشتہ کسی دور کی طرح آج بھی اس امر کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے اختلافات دُور کئے جائیں لیکن اختلافات کو رفع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اختلاف کے اصلی سبب پر بھی غور کیا جائے اور اس کے لئے جو علاج تجویز کیا جائے وہ صحیح اور نتیجہ خیز ہو۔

اختلافات دو طرح کے ہیں۔ مذہبی اور سیاسی۔ مذہبی اختلافات کو دُور کرنے کے لئے وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے جو اسلاف نے اختیار کیا تھا یعنی جمع بین المختلفات، یعنی اصولی اختلافی باتوں میں تطبیق کی کوشش۔ جیسا کہ اوائل اسلام میں اہلِ سنت والجماعت کی صورت میں ہوا اور صدہا فروعی فرقوں کے ہوتے ہوئے ایک ایسا مسلک تجویز ہوا جس میں اختلاف کی صورتیں کم اور اشتراک کی صورتیں زیادہ تھیں۔

مختلف فرقوں کے مابین مفاہمت کی کوششیں ہمیشہ ہوتی رہیں۔ برصغیر میں آخری دور میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اختلاف کے ہر محاذ پر مفاہمت کی کوشش کی اور جدید زمانے میں فکری سطح پر علامہ اقبالؒ نے ا[illegible] کے مخصوص اختلافات کو رفع کرنے کے لئے تطبیق کے جدید اصول وضع کئے۔

اختلاف ایک امر فطری ہے اور انسانوں اور ملتوں میں اختلاف ہوا کرتے ہیں لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ان اختلافوں کو رفع کیسے کیا گیا اور ان کو تعمیری اور آنحضرتؐ کی حدیث کے مصداق باعثِ رحمت کس طرح بنایا گیا۔

بزرگانِ سلف نے اس معاملے میں دو واضح اصول وضع کئے تھے۔ اوّل یہ کہ کسی فرقے کے صحیح اور غلط (یا حق اور باطل) ہونے کے لئے ایک معیار مقرر کیا اور یہ معیارِ حق کتاب وسنت ہے جو موقف اس کے مطابق ہے وہ حق ہے جو اس کے مطابق نہیں باطل ہے۔ آج بھی جو فیصلہ ہو یا تطبیق کی جو کوشش کی جائے اس کے مطابق ہونی چاہیئے۔

بایں ہمہ سعی وکوشش اختلاف کا پھر بھی باقی رہنا ممکن ہے کیونکہ کتاب وسنت کی تعبیر میں پھر بھی اختلاف (دیانتدارانہ) ہوسکتا ہے۔ اس کے لئے ایک زرین اصول اور ہے اور ہے مابہ الاشتراک (یعنی مشترک باتوں) پر زیادہ زور دینا اور مابہ الاختلاف کو اپنے عمل کی حد تک محدود رکھنا۔ ملت کے استحکام اور یک جہتی کی خاطر اس شق پر عمل کرنا نہایت ضروری ہے ورنہ افتراق وانتشار ناگزیر ہے۔

افسوس ہے کہ دورِ انحطاط میں علی الخصوص اور سارے ادوار میں علی العموم اس دوسری شق کا زیادہ خیال نہیں رکھا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلتا رہا ہے کہ امت کا بہت قیمتی وقت اور قیمتی توجہ جو تعمیر پر صرف ہونی چاہیئے فروعی اختلافی باتوں کے ہنگاموں میں ضائع ہوجاتی رہی۔

مذہبی فرقہ بندی کا قابلِ غور اور تشویشناک پہلو یہ ہے کہ اصولی عقیدوں میں صدہا مشترک باتوں کے باوجود فروعی باتوں کی ایک ایک جزء پر جھگڑا کیا جاتا ہے اور اتنا تعصب برتا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے لبا اوقات فرقہ پرست حضرات، دشمنانِ اسلام کے ہاتھ میں کھیل جاتے ہیں، یہ نہ سمجھتے ہوئے کہ دشمن پہلے ایک سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن جب اس کی مدد سے اسکے حریف کو ختم کر چکتا ہے تو پھر اپنے امدادی حلیف کو بھی نہیں چھوڑتا۔

یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی کہ آپس میں اختلاف بھی ہو تو دشمن کا آلہ کار نہیں بننا چاہیئے۔ باعث اس مرض کا یہ ہے کہ فرقہ پرست حضرات مابہ الاشتراک کے زرین اصول کی برکات سے بے خبر ہیں یا ملتِ اسلامیہ کے دشمنوں کے عزائم کا صحیح احساس نہیں رکھتے یا اس درجہ نفسانیت اور پندارِ نفس میں مبتلا ہیں کہ اپنے غصے پر قابو نہیں پاسکتے۔ یا پھر یہ ہے کہ فرقہ وارانہ اختلاف کی آگ بھڑکانے سے اپنی دکان کا چمکانا مقصود ہے۔ ان اسباب میں سے کوئی ایک سبب ضرور ہوگا۔

یہ درست ہے کہ مذہبی عقائد کے معاملے میں سچائی کی ہر ہر جزو تک کی حفاظت، پابندی اور پاسداری کوئی بُری بات نہیں اور جیسا کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب نے اپنی انگریزی کتاب (ریاست میں علمار کا حصّہ اور کردار) میں لکھا ہے کہ ہر ہر جزء تک سچائی کو جاننے اور ماننے اور اس پر عمل کرنے کا جذبہ ہی علمار کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس معاملے میں بھی مداہنت یا کمزوری نہ دکھائیں۔ لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ جزئیات اور فروعات تک کو اپنی ذات کی حد تک (یا گروہ کی حد تک) ماننا اور منوانا بالکل صحیح بات ہے۔ لیکن جزء کی خاطر ان گروہوں کے خلاف اعلانِ جنگ جو بہت سی بنیادی اصولی باتوں میں اشتراک رکھتے ہیں خصوصاً ایسے حالات میں کہ دشمن ہر اختلاف سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہر وقت تیار بیٹھا ہو اور ملت کا شیرازہ بکھر رہا ہو، امتِ اسلامیہ کی سب سے بڑی بدنصیبی رہی ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ منجملہ دوسرے بہت سے اسباب کے، ملّت کو اس قسم کے ذہن سے نقصان پہنچا ہے۔ بلکہ کئی اہم محاذوں پر مسلمان عساکر کی پیش قدمیاں رک گئیں۔ کئی میدانوں میں شکستیں ہوئیں کئی سلطنتیں مٹ گئیں، کئی ملکوں کے مسلمان غلام ہو گئے...... یہ بدنصیبی کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔ راقم الحروف علماء کا خادم اور نیاز مند ہے مگر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس قسم کے ذہن کو بدلا نہ جائے گا تو ملت اسلامیہ کی تباہی کی ذمہ داری میں قیامت کے روز سب سے زیادہ حصہ انہیں لوگوں کا ہوگا جو انتشار اور ضعف کا باعث بنتے ہیں اور باز پرس بھی انہیں سے زیادہ ہوگی۔ وما علینا الا البلاغ

اس ذہن کو بدلنے کے لئے ہمیں تین بنیادی اصولوں (یعنی ما بہ الاشتراک پر زور دینا، مشترک دشمن کے مقابلے پر متحد ہو جانا اور کسی بھی صورت میں دشمن کا آلۂ کار نہ بننا) کی تبلیغ و اشاعت اپنے ذاتی عمل اور کردار کے حوالے سے اور عقلی انداز سے کرنی ہوگی۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی مصیبتیں اور بھی بہت سی ہیں۔ ع

نکل کر چاہ کنعاں سے ابھی جانا ہے زنداں میں

ایک نہایت سنگین شعبۂ اختلاف (شاید سابق الذکر سے زیادہ خطرناک اختلاف) اور بھی ہے اور وہ ہے قدیم و جدید کی کشمکش اور نزاع، جو میری دانست میں نئے حالات میں اب اس مرحلے میں داخل ہو چکی ہے جسے دشمنی اور جنگ کا مرحلہ کہا جا سکتا ہے۔

میں اس نزاع کو اس لئے زیادہ خطرناک سمجھتا ہوں کہ جہاں علمار کی فرقہ پرستی ایک داخلی قسم کی لڑائی تھی وہاں قدیم و جدید کی جنگ میں ہم اسلام کے خلاف باہر کے دشمن نظریات کے آلۂ کار ہیں، علماء کی فرقہ بندی

سے ضعف تو پہنچا تھا لیکن فرقوں کے مابین ایک ایسا منہاج موجود تھا جس پر سب متفق تھے اور اس کی طرف انہیں بلایا جا سکتا تھا۔ کتاب و سنت کے اصول پر سب فرقوں سے بات ہو سکتی تھی اور یہ سب فرقے آپس میں الجھ کر بھی اور صحیح راستے سے بھٹک کر بھی بالآخر رجوع قرآن و حدیث ہی کی طرف کرتے تھے۔ ان کی جنگ اسلام کی محبت کی وجہ سے ہوتی تھی (ہر چند کہ وہ گاہے غیر معتدل ہو کر غلط ہو جاتی تھی) لیکن اسلام ہی کی محبت کے واسطے سے آپس میں مفاہمت کی صورتیں بھی ممکن ہو جاتی تھیں۔ لیکن قدیم و جدید کی نزاع میں منہاج ہی مختلف ہیں خصوصاً اس کی آخری انتہائی شکلوں میں کہ ان میں اسلام کا تذکرہ تک بھی گوارا نہیں رہا۔ بلکہ عام مذہبی اور اختلافی دلیل بھی ناپسندیدہ دلیل سمجھی جاتی ہے) اس جنگ میں اسلام واضح طور سے اسلام دشمنوں کا نشانہ ہے۔

جدید طرز فکر کا سارا مرجع مغربی فکر و نظر ہے۔ اس فکر کے ابتدائی مرحلوں میں (اور میں ان کوششوں کو مخلصانہ کہہ سکتا ہوں) تطبیق کی نہج یہ تھی کہ اسلام و قرآن کے احکام کی عقلی تعبیر پر زور دیا جاتا تھا اور یہ اس لئے چنداں نامانوس طریقہ نہ تھا کہ عقلی تدبر، اسلامی شعوریات میں صدیوں سے موجود چلی آتی ہے اور ایک حد تک اس کا فائدہ بھی ہے۔

لیکن ہوا یہ کہ مسلمان ممالک میں مغربی علوم کی اشاعت جب زیادہ ہو گئی اور مغرب کے سیاسی غلبے کے ساتھ ساتھ مغرب کی معاشرت میں غلبہ پا گئی تو ایک عجیب و غریب رجحان یہ ابھرا کہ اسلام کے احکام کی ایک منفی اور شکست خوردہ معذرتی تعبیر کا آغاز ہوا۔ اب مغربی افکار کی سند سے اسلام کے احکام کو معقول یا غیر معقول ثابت کرنے کا طریقہ رائج ہوا۔ یعنی اسلام کی وہی باتیں صحیح قرار دی جانے لگیں جنہیں مغربی علوم کی روشنی میں صحیح ثابت کرنا ممکن ہو یا بقول اکبر جنہیں اغیار معقول کہہ دیں چلئے یہاں تک بھی ایک وجہ تسلی کی موجود تھی کہ اس طرح مسلمانوں کے ایک جدید طبقے کو اسلام سے کلیۃً برگشتہ ہونے سے روکا جا سکتا تھا لیکن اب معاملہ بہت آگے بڑھ آیا ہے۔

اب عام ذہن یہ ہے کہ اسلام کا نام مجبوری سے لینا پڑ جائے تو دوسری بات ہے مگر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک بڑا حصہ مغربی افکار و کردار کا اتنا والہ و شیدا ہو گیا ہے کہ اولیت اور ترجیح مغربی عقیدے اور فکر ہی کو دی جاتی ہے بلکہ بہت سے ایسے تعلیم یافتہ لوگ بھی ہیں جو اسلام دشمن عقیدوں کے حق و حمایت میں لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

ان حالات میں قدیم و جدید کی جنگ اس سرحد میں داخل ہو جاتی ہے۔ جسے کسی صورت میں فرقے کی

جنگ نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اسے اور مغرب کے لادین نظریات کی باہمی جنگ ہی سمجھا جا سکتا ہے اور مصیبت یہ ہے کہ ہماری سیاسی گروہ بندی بھی اسی اصول پر آ پہنچی ہے جس میں ایک طرف اسلام ہوتا ہے اور دوسری طرف مغربی نظریے۔ مغربی پاکستان کی سیاسی گروہ بندی کا اسلوب اب یہی ہے۔

بہرحال گفتگو مفاہمتی ذہن اور طریق کار کی ہو رہی تھی۔ مذہبی فرقہ بندی کے لئے محولہ بالا ئین اصولوں پر عمل (یعنی ما بہ الاشتراک پر زور اور مشترکہ دشمن کے خلاف اتحاد) شاید کفایت کر جائے لیکن اس دوسرے معاملے میں کیا کیا جائے گا؟ اس کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہاں بھی ما بہ الاشتراک والے اصول پر عمل ہو لیکن یہ اشتراک کسی دنیوی بنیاد پر ہی ہو گا کہ نئے سیاسی فرقے اپنی نہاد میں سیکولر اور دنیوی ہیں اور دینی بنیاد کے قائل ہی نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خارجی دشمنوں کے مقابلے میں پاکستان کی بقا اور حفاظت کے معاملات میں ما بہ الاشتراک پر عمل ہو اور باقی امور میں منہاج اپنا اپنا ہو یا معاشی مسئلے میں اشتراک سوچا جائے اور باقی معاملات میں الگ الگ پروگرام ہوں۔ بہرحال یہ نئی فرقہ بندی جو سیاسی شعبوں میں ابھر آئی ہے پہلے کے مقابلہ میں زیادہ پیچیدہ اور خطرناک ہے اور اس بارے میں میرا ذہن خود صاف نہیں تاہم کچھ نہ کچھ سوچنا ہو گا۔

میرے خیال میں اس پیچیدہ صورت حال کا ایک ہی حل ہے اور وہ ہے معقولیت۔ معقولیت سے میری مراد یہ ہے کہ پاکستان کے سارے مسئلہ پر عقلی نظر ڈالی جائے۔ مگر دیانتداری سے پاکستان کے مسلے دو ہیں۔
(۱) پاکستان کی سالمیت کی حفاظت۔ (۲) پاکستان میں اسلامی زندگی کا فروغ۔

اگر ہم پہلے مسئلے میں ما بہ الاشتراک کو اپنا لیں اور ہر اس آدمی اور جماعت کا اشتراک حاصل کریں جو اس نصب العین کا اقرار کرتی ہو تو دوسرے مسئلے کے متعلق مفاہمت بھی ممکن ہو سکتی ہے۔

اسلامی زندگی والے مسئلے میں اگر علما بالخصوص اور اسلام سے محبت رکھنے والے حضرات بالعموم پہلے مرحلے میں باہم متفق ہو جائیں تو باقی اختلاف کرنے والوں کو دلیل اور فکری تبلیغ سے قائل کیا جا سکتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ فضا کو تخریبی اختلاف سے پاک کرنا ہر دیانتدار اور مخلص آدمی کا فرض ہے اور اس معاملے میں جامعہ محمدی کے سامنے دوسرا بڑا نصب العین قدیم و جدید تعلیم میں ایک طرح کی مفاہمت اور امتزاج پیدا کرنا ہے۔

یہ بڑا مشکل کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جتنی کوششیں اس امتزاج کے لئے ہوئیں تقریباً ناکام ثابت ہوئیں۔ اس کا باعث یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قدیم و جدید کے علمبردار اس معاملے میں تعصب اور ضد کا ارتکاب کر رہے ہیں لیکن قصہ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے مسئلہ کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ اس میں انتہا درجے کی

وسیع النظری کے ساتھ ساتھ وسیع پیمانہ کی منصوبہ بندی اور فکری تحقیق و تدقیق کی بھی ضرورت ہے۔ پرانے دینی اور عام علوم وسیع الاطراف ہیں اور نئے علوم ان سے بھی زیادہ وسیع الاطراف۔ ان دونوں میں ضروری قطع و برید کرنے ہی سے علوم کا وہ درمیانی حصہ برآمد ہو سکتا ہے جسے ہم اپنے مدِنظر رکھ لیں تو دونوں ضرورتیں پوری ہو سکیں۔

مگر یہ ہو کیسے ؟ پچھلی صدی میں ہماری نئی تعلیم کا آغاز ایک جھگڑے سے ہوا تھا۔ اس جھگڑے کو انگریزی حکمتِ عملی نے بہت فروغ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نئے علوم والوں کی ایک مفاد یافتہ جماعت نکل آئی جس نے مفاہمت کے تمام راستے بند کر دیئے۔ یہ لوگ انگریزوں اور عیسائیوں سے بھی زیادہ دینی علوم کے مخالف نکلے۔ انہوں نے علماء کی تحقیر اور تذلیل میں اپنی ساری قوتیں صرف کر دیں۔ اس طرح مسجد اور کالج کی مفاہمت کے امکانات کم سے کم ہو گئے۔ اس پر جدید تعلیم والوں نے معاشرت اور فکر میں مغرب کی کورانہ غلامی اختیار کر لی۔ نتیجہ اب یہ ہے کہ اس طبقے کے نزدیک دینی تعلیم رجعت پسندی کا دوسرا نام ہے۔ اس عرصے میں علامہ اقبال نے قدیم و جدید کی مفاہمت کے لئے بہت کچھ کیا لیکن ان کی روایت آگے چلی نہیں۔

اصولی لحاظ سے مسئلے کا حل صرف یہ ہے کہ تعلیم کے لئے دو کیمپ نہیں ہونے چاہئیں۔ پرانے اور نئے علوم میں ایک علمی اور معقول اصول کے تحت مناسب قطع و برید کر لی جائے۔ البتہ تخصیص علمی کے لئے خاص درسگاہیں بھی موجود رہیں تو مضائقہ نہ ہوگا۔

اس کے لئے دو باتوں کی ضرورت ہے۔ اوّل :۔ اپنے ملک کے تعلیمی نصب العین اور غایتوں کی قطعی تفریق و تحدید۔ دوم :۔ قدیم و جدید میں معاشرتی اختلاف اور طریقِ زندگی کا جو فرق پایا جاتا ہے اسے آہستہ آہستہ کم کر کے "یک رنگ" معاشرے کی تشکیل کی جائے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ملک کی معاشی تشکیل کا سوال بہت اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ جب تک ملک میں موجودہ امریکی طرزِ معاشرت موجود ہے نہ معاشی مساوات و عدل ممکن ہے اور نہ وہ معاشرتی یک رنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ذہنی ہم آہنگی کا سرچشمہ بن سکتی ہے۔

آیئے ہم سب مل کر معاشرتی یک رنگی اور اس کے ساتھ ساتھ معاشی عدل و مساوات کے لئے کام کریں۔ جب تک ہماری درسگاہوں میں امریکی طرز کی فضول خرچی اور معاشرتی "لفنگاپن" موجود ہے چند نصابوں کو ادھر ادھر کر دینے سے کوئی اصلاح ممکن نہیں۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دینی مدرسوں کے نصابوں میں انگریزی کا مضمون رکھ دینے سے کوئی بھاری

انقلاب پیدا ہو جائے گا۔ یہ ان کی نافہمی ہے۔ جدید علوم صرف انگریزی کا نام نہیں، یہ تو ان افکار و نظریات کا نام ہے جو صدہا شعبوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس صورت میں محض انگریزی پڑھ لینے سے کیا حاصل ہو جائے گا۔

اس کے برعکس لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ مدرسوں اور کالجوں کے کورسوں میں دینیات کے چند رسالے رکھ دینے سے علوم اسلامیہ کی نمائندگی ہو جاتی ہے۔ یہ بھی غلط اندازہ ہے۔ علوم اسلامیہ بھی ایک وسیع سلسلۂ علم ہے، جس کے لئے بہت کچھ اور بھی پڑھنا لازم ہے۔ محض دل کو خوش کرنے یا رفع الوقتی کے لئے یہ سب ٹھیک ہے لیکن صحیح علاج یہ نہیں۔ صحیح علاج ایک دیانتدارانہ منصوبہ کے تحت پوری ملکی تعلیم کا صرف ایک کیمپ قائم کرنا ہے تاکہ سب لوگ ایک نظام تعلیم سے فیض یافتہ ہوں اور تعلیمی لحاظ سے سب کا درجہ ایک ہی سلسلے کے حوالے سے متعین ہو۔ یہ موجودہ "اونچی بادشاہوں کی تعلیم" اور حقیر "اچھوتوں کی (دینی) تعلیم" کا سلسلہ علم اور شرافت کی توہین ہے۔

ہمارا ملک اسلام کے نام سے بہت فائدہ اٹھاتا رہتا ہے۔ اگر اس کے بدلے میں تھوڑی سی خدمت اسلام کی اس طرح کر دے کہ علوم اسلامیہ کو بھی ایک معزز سلسلۂ علم سمجھ کر انہیں جدید سلسلۂ علم کے ساتھ مربوط کر دے، اس طرح کہ دونوں کا لبِ لباب یک جا جمع ہو جائے تو یہ بہت بڑی خدمت ہو گی۔ اس کے ہمراہ تخصیصی درسگاہیں (یعنی اعلیٰ تعلیم کے دینی مدارس) بھی چلتے رہیں تو اس سے نقصان کچھ نہ ہو گا، فائدہ ہی ہو گا کہ ان میں علومِ قدیمہ کے ماہرین اور متخصصین بھی پیدا ہوتے رہیں گے۔ یہ اگر حکومت کرے تو ملک پر بڑا احسان ہو گا۔ ان سارے کاموں کے ساتھ ساتھ اگر جدید علوم کو "مسلمان" بنانے کا کام بھی جاری ہو جائے تو یہ اس سے بھی بڑی خدمت ہو گی۔

بعض صاحبان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مغرب کے علوم معصوم ہیں۔ یہ ان کی بھول ہے۔ تجرباتی سائنس کو چھوڑ کر مغربی علوم کا موجودہ سارا سلسلہ (بلکہ اس کی ہر شاخ، فلسفہ، نفسیات، اطلاقی معاشیات، عمرانیات، نشریات، سیاسیات، سوشل ورک، علم آبادی، علم اعداد و شمار، غرض ہر ہر علم) اپنے نقطۂ نظر اور ماحصل کے اعتبار سے خدا، رسول، مذہب، آخرت، نیکی، بدی (اخلاق و شرافت) معاشرت، جزا و سزا اور اس قسم کے دوسرے مسائل میں اسلام کی ضد نہیں تو اسلام اور اخلاق کے بارے میں ضعفِ اعتقاد کا موجب ضرور ہے اور کئی مقامات پر تو اسلام سے اس کا کھلا ٹکراؤ ہے۔ ایسی صورت میں یہ کہنا کہ انہیں دینی مدرسوں کے نصابوں میں جوں کا توں رکھ دینا چاہیئے نہایت غلط مشورہ ہے۔ صحیح مشورہ یہ ہے کہ ان علوم کو "مسلمان بنا کر"